اسلامی تعلیمات

کسی بھی گناہ کو معمولی نہ سمجھے

توبہ میں جلدی کرے

{افادات : حضرت تھانویؒ}

مولانا محمد معاویہ سعدی استاذ شعبۂ تخصص فی الحدیث مظاہر علوم سہارنپور

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِذْ تَلَقَّوْنَهُ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُمْ مَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا وَهُوَ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمٌ

(یاد کرو اس وقت کو جب تم اُس (بہتان اور الزام) کو لے رہے تھے اپنی زبانوں پر، اور کہہ رہے تھے اپنے منھ سے وہ بات جس کی تم کو مطلق خبر نہ تھا، اور تم سمجھ رہے تھے اس کو معمولی بات، جب کہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بڑی بات تھی)۔

یہ سورۂ نور کی آیتیں ہیں، ان میں ایک خاص گناہ کو ہلکا سمجھنے کی مذمت بیان کی گئی ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا خاص اسی گناہ کو معمولی سمجھنا برا ہے (جیسا کہ سبب نزول کا مقتضی ہے) یا ہر گناہ کو جب کہ وہ کبیرہ ہو؛ ہلکا سمجھنا مذموم ہے۔

سو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کسی گناہ کی تخصیص نہیں، کیونکہ سبب نزول سے جگہ کی تخصیص تو ہوا ہی نہیں کرتی، رہا شبہ "عظیم" کی تخصیص کا؛ سو ہر گناہ گو وہ صغیرہ ہو، اپنی حقیقت کے اعتبار سے عظیم ہی ہے، کیونکہ گناہ کی حقیقت اللہ جل جلالہ کی نافرمانی ہے۔

گناہ کی بڑائی

اور ظاہر ہے کہ نافرمانی گو کسی قسم کی ہو زیادہ ہی بری ہے، اور گناہوں کے درجات میں جو چھوٹائی بڑائی کا تفاوت ہے وہ ایک امر اضافی ہے، کہ ایک بہت بڑا گنا ہے اور دوسرا اس سے چھوٹا، ورنہ اصل حقیقت کے اعتبار سے سب گناہ بڑے ہی ہیں، کسی کو ہلکا نہ سمجھنا چاہئے، اس چھوٹے بڑے ہونے کی ایسی مثال ہے جیسے آسمانِ دنیا عرش سے تو چھوٹا ہے، مگر حقیقت چھوٹا نہیں ہے، دوسری مثال ناپاکی اور گندگی کی

ہے، تھوڑی ہو یا بہت، مگر حقیقت تو دونوں کی پلیدی ہی ہے، اور راز اس میں یہ ہے کہ جتنی کسی کی عظمت اور احساس ہوتا ہے اتنی ہی اس کی نافرمانی کرنا بری بات ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور احسان کے برابر نہ کسی کی عظمت نہ کسی کا احسان، تو اس کی نافرمانی سب سے زیادہ بری ہوگی، پس وہ اپنی اس حقیقت اور مقتضی کے اعتبار سے عظیم ہی ہوگی، اسی راز کی وجہ سے فقہاء نے لکھا ہے کہ استخفاف گناہ (یعنی ہلکا اور معمولی سمجھنا) کفر ہے؛ گو صغیرہ ہی ہو، غرض خدا تعالیٰ کی ہر نافرمانی ''عظیم'' ہی ہے، اور اس اعتبار گذشتہ آیت میں مذکور توبیخ ہر گناہ کو عام ہوئی۔

گناہ کی چنگاری

گناہ کی مثال تو آگ کی سی ہے، ایک چنگاری بھی مکان جلانے کے لیے کافی ہے، اور بڑا انگارہ بھی، پس صغیرہ چنگاری ہے، اور کبیرہ انگارہ، لہذا عمل کرنے کے لیے یہ پوچھنا کہ یہ صغیرہ ہے یا کبیرہ ؟ شبہ میں ڈالتا ہے کہ اگر کبیرہ ہوگا تو بچیں گے، اور اگر صغیرہ ہوا تو خیر! ہم ایسے شخص سے اجازت لیتے ہیں کہ لاؤ تمہارے چھپر میں چھوٹی سی چنگاری رکھ دیں، اگر یہ ناگوار ہے تو خدا تعالیٰ کی نافرمانی کیسے گوارا ہے؟ وہ چنگاری گو چھوٹی ہو مگر پھیلتے پھیلتے انگارہ ہی ہوجائے گی، اسی طرح آدمی اول صغیرہ کرتا ہے، اور وہ چھوٹتا نہیں، اس اصرار سے وہ صغیرہ، کبیرہ ہوجاتا ہے، اور زیادہ مدت تک کرتے رہنے سے اس کو ہلکا ہی سمجھنے لگ جاتا ہے، اس وقت نعوذ باللہ کفر کا اندیشہ ہوجاتا ہے۔

توبہ برلب:

بعضے توبہ کے بھروسہ گناہ کرتے ہیں، اور یہ سخت غلطی ہے، کیونکہ جب گناہ کی عادت ہوجاتی ہے پھر توبہ بھی مشکل ہوجاتی ہے، اس لیے نئے گناہ سے جن کی ابھی لذت نہیں رچی؛ توبہ آسان ہے، اور عادت والے گناہ سے توبہ بہت مشکل ہے، علاوہ اس کے جب چھوٹے گناہوں سے اجتناب نہیں کیا جاتا ہے تو طبیعت بے باک ہوجاتی ہے، اور دل کھل جاتا ہے، پھر رفتہ رفتہ کبیرہ بھی ہونے لگتے ہیں، جیسے صاف کپڑے کو بارش میں کیچڑ وغیرہ سے بچایا جاتا ہے، اور جب بہت چھینٹے پڑ جاتے ہیں تو پھر دامن کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے، اور وہ کپڑا بالکل خراب ہوجاتا ہے، ایسا ہی گناہ کا معاملہ ہے کہ جس گناہ کی طبیعت عادی ہوجاتی ہے وہ پرانا ہوجاتا ہے، اور چھوٹتا نہیں، مثلاً زمینداروں کا شتکاروں وغیرہ میں یہ گناہ بمنزلہ عادت ہوگئے

ہیں: غصب، ظلم، بیع باطل، جیسے آم اور بیر کی بیع، اور یتیموں نابالغوں کے مال میں تصرف، البتہ شراب نہیں پئیں گے، تو یہ تفاوت اسی عادت کے ہونے نہ ہونے سے ہے، پس ثابت ہو گیا کہ عادت ہو جانے سے اصرار، واستخفاف بلکہ استحسان تک کی نوبت آ جاتی ہے، ایسے میں توبہ مشکل ہو جاتی ہے، اور اگر ہوتی بھی ہے تو زبانی، جیسے کسی نے کہا ہے ؎

سبحہ در کف، توبہ بر لب، دل پر از ذوق گناہ
معصیت را خندہ می آید بر استغفار ما

چنانچہ ان امور سے توبہ تو کیسی؟ اور الٹے ان کے ترک کو خلاف ریاست اور ذلت سمجھتے ہیں، اور گناہ سے دل برا نہیں ہوتا، حالانکہ ایمان کی نشانی یہ ہے: ''سَرَّتْکَ حَسَنَتُکَ وَسَاءَ تْکَ سَیِّئَتُکَ'' (یعنی نیکی کر کے خوشی ہو، اور برائی سے دل کڑھے) غرض توبہ ان وجوہ سے مشکل ہو جاتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ توبہ کے بھروسہ گناہ کرنا نہایت حماقت ہے، مگر نادان پھر بھی دھوکے میں ہیں، اور توبہ کے توقع پر گناہوں پر دلیری کرتے ہیں، اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی کے پاس مرہم ہو اور اس کے بھروسے اپنی انگلیاں آگ میں جلا لیتا ہو، کیا یہ شخص پورا احمق نہیں ہوگا؟ کیا کسی اہل عقل نے کبھی ایسا کیا ہے؟ جب آگ پر دلیری نہیں کی جا سکتی، تو دوزخ کی آگ تو اس آگ سے ستر حصہ زیادہ تیز ہے۔

توبہ کی حقیقت:

توبہ کی حقیقت ہے: ندامت، جس کو یوں بھی تعبیر کیا گیا ہے: ''**تحرُّق الحشاء علی الخطأ، وتألُّم القلب علی الاثم**'' یعنی توبہ نام ہے غلطی ہو جانے پر دل کے کڑھنے اور جلنے کا، اور اس کا تکملہ ہے: اللہ تعالیٰ کی عظمت کا استحضار اور اس کے عذاب کا مراقبہ، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''**وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَھُمْ ذَکَرُوْا اللہَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِھِم**'' مطلب یہ کہ اگر ان سے گناہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے عذاب کو یاد کرتے ہیں، یہاں پر ذکر اللہ میں مضاف محذوف ہے، یعنی: ''ذکروا عذاب اللہ اوعظمۃ اللہ'' اور واقعی اللہ تعالیٰ کی عظمت ایسی ہی چیز ہے کہ اس کے یاد رکھنے سے نافرمانی نہیں ہو سکتی، اور وہ ہے بھی قابل یاد رکھنے کے، پس اس کو دل سے بھلا کر اس کی نافرمانی پر کمر باندھ لینا بڑی بیبا کی کی بات ہے۔

فراغت کی قدر:

بعضے منتظر رہتے ہیں کہ فلاں کام کر کے توبہ اور تدارک کر لیں گے، حالانکہ ممکن ہے کہ اس کو موانع

کے ہجوم سے اتنی مہلت ہی نہ ملے، اس لیے اس وقت کی فراغت کوغنیمت سمجھے، اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ خدا تعالیٰ کی عظمت اور اس کے عذاب کا مراقبہ کرنے سے توبہ نصیب ہوتی ہے تو اب دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ اس مراقبہ کے لیے بھی فرصت اور فراغ کی ضرورت ہے، بعض لوگ اس فراغ کی بھی قدر نہیں کرتے، حالانکہ وہ بہت بڑی غنیمت چیز ہے، حدیث میں ہے: ''اغتنم خمساً قبل خمس'' اور ان میں سے ایک یہ ہے: ''فراغک قبل شغلک'' مشغول آدمیوں کی حالت میں غور کرنے سے فراغ کی قدر معلوم ہوتی ہے، وہ بیچارے ہر وقت بلا میں مبتلا ہیں، ان کو کوئی وقت فرصت کا اور سوچنے کا نہیں ملتا، بس یہ حالت ہے کہ: ع چو میرد مبتلا میرد، چو خیزد مبتلا خیزد

اور اسی حدیث شریف میں دوسری چیز ہے: ''صِحَّتَکَ قَبلَ سَقَمِکَ'' تیسری ''شَبَابَکَ قَبلَ هَرَمِکَ'' نیز حدیث شریف میں: ''مَنْ اَصْبَحَ آمِنًا فِي سِرْبِهِ مُعَافیً فِيْ جَسَدِهٖ وَعِنْدَهٗ قُوتُ یَوْمِهٖ فَکَاَنَّمَا حِیْزَتْ لَهُ الدُّنْیَا بِحَذَافِیْرِهَا'' (جو شخص اس حالت میں صبح کرے کہ اپنی ذات میں مامون ہو، اپنے جسم میں صحتمند ہو، اور اُس دن کی روزی رکھتا ہو تو گویا اس کے لیے پوری دنیا جمع کردی گئی) واقع میں یہی بات ہے، کیونکہ اگر زیادہ بھی ہو تب بھی اس کے لیے تو ہر روز ایک ہی دن کی روزی آئی گی، لہذا اس میں یہ اور قلیل والا برابر ہی ہوئے۔

چنانچہ اسی زمانے کے ایک متمول کی حکایت ہے کہ وہ ایک روز اپنے خزانہ کو دیکھنے گیا جو زیر زمین بڑے مکان میں تھا، اور وہ مکان گاہ گاہ کھلتا تھا، اتفاق سے اس کو وہاں دیر لگ گئی، اور کسی کو خبر تھی نہیں، ملازموں نے دروازہ بند کرلیا، مکان بہت بڑا تھا، دروازوں کا سلسلہ بڑی دور تک تھا، اور یہ اتنا اندر تھا کہ وہاں سے آواز باہر نہیں آسکتی تھی، الغرض وہ یہودی وہاں جواہرات کے ڈھیروں میں بھوکا پیاسا مر گیا، اس وقت کوئی اس سے پوچھتا تو اس کے نزدیک ایک بسکٹ اور پانی کے سامنے سارا خزانہ ہیچ تھا۔

توبہ میں جلدی:

الغرض فراغ، صحت اور ضروری سامان خرچ یہ بہت غنیمت چیزیں ہیں، یہ ہر وقت میسر نہیں آتیں، اس لیے ان کو غنیمت سمجھے، اس وقت کی فرصت کو ہاتھ سے نہ دے، اور توبہ بہت جلدی کرلے، بعضے لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت کے ناز پر توبہ نہیں کرتے، حالانکہ رحمت اور مغفرت کی خبریں اس

لیے دی گئی ہیں کہ تائب کو یاس نہ ہو، جرأت ودلیری کے واسطے نہیں کہ اور دلیر ہو کر گناہ کرو، بلکہ احسان اور رحمت خداوندی کی اطلاع کا مقتضاء یہ تھا کہ متأثر ہو کر اور بھی طاعت اور فرمانبرداری کرتے، نہ کہ اور جرأت، گستاخی اور نافرمانی کی جائے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں کوئی کسی کے ساتھ احسان کرتا ہے تو وہ اور زیادہ محبت واطاعت کرتا ہے، نہ کہ مخالفت وسرکشی۔

لذت گناہ:

رہا یہ اشکال کہ واقعی اس کا مقتضاء تو یہی تھا، مگر ایک دوسرا مقتضاء کہ لذت ہے؛ غالب ہو گیا، چنانچہ گناہ میں ظاہر ہے کہ کیسا مزہ اور لذت ہے، اس لیے اس کو چھوڑنا مشکل ہے، سو اگر ادراک صحیح ہو تو یہ بات بالکل ٹھیک نہیں، کیونکہ گناہ میں جو لذت ہے اس کی مثال کھجلی جیسی ہے کہ خود اس میں کوئی لذت نہیں، محض مرض کی وجہ سے لذت معلوم ہوتی ہے، پھر فوراً ہی سوزش پیدا ہوتی ہے، سو یہ دراصل مرض ہے، جیسا کہ سانپ کے کٹے ہوئے کو کڑوا بھی میٹھا معلوم ہونے لگتا ہے، سو کسی عاقل کو ایسی لذت؛ علاج سے نافع نہیں ہوتی۔

لذت طاعت:

البتہ حقیقی لذت طاعت میں ہے، چونکہ ان لوگوں نے ابھی اعمال آخرت، پرہیزگاری اور طاعت کی لذت چکھی نہیں، اس لیے گناہ اور نفسانی لذات ان کو مرغوب معلوم ہوتی ہیں، آخرت اور پرہیزگاری کی لذت حضرت ابراہیم بن ادہمؒ سے پوچھئے، کہ کس طرح اس کے پیچھے سلطنت کی لذت ترک کر دی، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس لذت کے پیچھے شاہانہ لباس ترک کر کے غریبانہ کپڑوں پر کفایت کی، بلکہ یہ دنیوی لذتیں ونعمتیں تو جان کے لیے عذاب ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”وَلاَتُعْجِبْکَ اَمْوَالُهُمْ وَلاَ اَوْلاَدُهُمْ إِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا“

(آپ کو تعجب میں نہ ڈالیں اُن (کافروں ومنافقوں) کے مال اور اولاد، اللہ تعالیٰ تو ان کو (اِن کے ذریعہ) عذاب دینا چاہتا ہے دنیا میں (بھی)۔

نافرمانی کا اثر:

حقیقت میں آرام تو صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے میں ہے :اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ“ نافرمانیوں کی بدولت طرح طرح کی بیماریاں (ایڈز، کینسر وغیرہ) آپس کی نااتفاقیاں وغیرہ ظہور

میں آتی ہیں، اوران بیماریوں کے ظاہری اسباب گوامور طبعیہ ہوں؛ مگر حقیقی اور اصلی اسباب معاصی ہی ہیں، اور دونوں میں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ سزا تو ہو گناہ کی وجہ سے، مگر ظہور اس سزا کا اسباب طبعیہ کے ذریعہ سے ہوا ہو، لوگ چونکہ گناہوں کو ان امراض کا سبب نہیں قرار دیتے ہیں اس لیے صرف طبی علاج کرتے ہیں، اور اصل علاج کہ استغفار ہے وہ نہیں کرتے، وہ بھی کرنا چاہئے۔

گناہوں سے مصائب کا آنا نصوص سے ثابت ہے: ''مَا أَصَابَكُمْ مِن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُم'' ایک بزرگ گھوڑے پر سوار تھے، وہ شوخی کرنے لگا، فرمانے لگے: ہم سے آج کوئی گناہ ہو گیا ہے، اسی کی وجہ سے یہ ہماری نافرمانی کرتا ہے۔

طاعت کا اثر:

اس کے مناسب جناب پیر ومرشد حضرت حاجی صاحب علیہ الرحمۃ کی حکایت ہے کہ ایک دن پیران پیر (کلیر) سے واپس ہوتے ہوئے سہانپور تشریف لائے، لوگوں نے آپ کو ایک ایسے مکان میں ٹھہرایا جہاں ایک جن سخت آزار پہنچا ہوا تھا، حتی کہ وہ مکان بالکل معطل چھوڑ دیا گیا تھا، جب حضرت رات کو اٹھے، دیکھتے کیا ہیں کہ ایک آدمی آیا اور سلام اور مصافحہ کر کے بیٹھ گیا، حضرت نے تعجب سے پوچھا کہ تم کون ہو؟! کیونکہ مکان بند تھا، اس نے عرض کیا: میں ایک جن ہوں، اور میری ہی وجہ سے یہ مکان خالی پڑا ہے، حضرت حاجی صاحب نے فرمایا: تم کو خدا کا خوف نہیں کہ لوگوں کو تکلیف دیتے ہو؟ اس نے عہد کیا کہ میں اب تکلیف نہ دوں گا اس کے بعد وہ جن اس مکان سے چلا گیا اور وہ مکان آباد ہو گیا، تو یہ اثر جن پر حضرت کی طاعت ہی کا تھا۔

اعمال کا دھوکہ:

آج کل اول تو گناہ کو مصیبت کا سبب ہی نہیں سمجھتے، اور اگر کوئی سمجھا بھی ہے تو اپنے گناہ کو نہیں، بلکہ دوسرے کے گناہ کو، پہلے بزرگوں کی حالت اس کے برعکس تھی، حضرت ذوالنون مصریؒ سے لوگوں نے درخواست کی کہ حضرت بارش نہیں ہوتی، فرمایا میں سب سے زیادہ گناہ گار ہوں شاید بارش میری وجہ سے نہیں ہوتی، لہذا ہم لوگوں کو اپنے گناہوں پر نظر کرنی چاہئے، مگر آج کل بجائے گناہ کے اپنی خوبیوں پر نظر ہوتی ہے، حالانکہ وہ خوبیاں ہی کیا ہیں، اور اس کی خبر نہیں کہ ہمارے ناقص اعمال درگاہ خداوندی کے قابل

ہرگز نہیں ہوسکتے ہیں، تو یہ سب محض دعویٰ اور پندار ہے۔

ہم لوگ اپنے جن اعمال خیر پر نازاں ہوتے ہیں وہ خیر صرف ہمارے گمان ہی کے موافق ہے، ورنہ حقیقت میں بوجہ خلاف طریق اور بے ضابطہ ہونے کے قابل قبول بھی نہیں، مثال کے طور پر یاد آیا کہ ایک شخص بے طور مجھ کو پنکھا جھلنے لگے، مجھ کو ناگوار ہوا، اب وہ صاحب تو سمجھتے ہوں گے کہ ہم خدمت کرر ہے ہیں اور آرام دے رہے ہیں، مگر یہاں اس کے خلاف کلفت اور کدورت ہورہی ہے۔

اور بعض لوگ اپنے ہی گناہوں کو مصائب کا سبب سمجھ کر طاعت و استغفار میں مشغول ہوتے ہیں، مگر اس استغفار اور عبادت میں ابتداء سے یہ نیت ہوتی ہے کہ جب یہ مراد حاصل ہوجائے گی تو اس کو چھوڑ دیں گے، مثلاً طاعون کے زمانے میں نماز پڑھتے ہیں، مگر اس کے ختم کے ساتھ ہی اس کو بھی چھوڑ دیتے ہیں، یہ تو بالکل دھوکہ کی صورت ہوگئی، اسی باب میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو: ’’دعانا لجنبه أو قاعداً أو قائماً‘‘ (اٹھتے بیٹھتے ہم کو ہی پکارتا ہے) اور جب اس کی تکلیف جاتی رہتی ہے تو احسان ناشناسی سے اس کی حالت یہ ہوجاتی ہے: ’’كَأَن لَّمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرٍّ مَّسَّهُ‘‘ (گویا کسی مصیبت میں ہم کو کبھی پکارا ہی نہیں تھا) ہمارے اس طرز عمل کی سزا تو بہت سخت ہونی چاہئے تھی، مگر یہ ان کی رحمت وعنایت ہے کہ باوجود اتنی خطاؤں، شوخیوں اور گستاخیوں کے روزی وعافیت ویسی ہی برقرار رکھتے ہیں۔

بہرحال گناہ کا مقتضاء کلفت ہی ہے؛ فی الحال بھی، فی المآل بھی، (اب بھی، آئندہ بھی) تو ایسی چیز میں لذت ہی کیا ہوئی، لہذا وہ اشکال دفع ہوگیا، اور گناہ کرنے کا کوئی معقول عذر نہ رہا، اور ثابت ہوگیا کہ گناہ ہلکا سمجھنے کی چیز نہیں؛ نہ اعتقاداً کہ کفر ہے، اور نہ عملاً وحالاً کہ خلاف دین اور خلاف عقل ہے، حدیث میں ہے کہ مؤمن گناہ کو ایسا سمجھتا ہے جیسے کسی پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہو اور وہ گرا چاہتا ہو، اس لیے اس سے بچتا اور ڈرتا ہے، اور منافق گناہ کو ایسا سمجھتا ہے جیسے ایک مکھی آ کر بیٹھ گئی اور اس کو ہاتھ سے اڑا دیا، اس لیے بے دھڑک گناہ کرتا ہے اور ڈرتا نہیں۔